خرید ہی تو لائے ہیں۔''

جگو نے سرزنش کی: ''تمہیں اتنا بے لگام نہ ہونا چاہیے تھا۔ بہو دل پر چوٹ لگتی ہے تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔''

جالپا نے بیدردی سے کہا: ''ایسے حیادار نہیں ہیں دادی! اسی عیش کے لیے تو ایمان بیچا ہے۔ پوچھا نہیں دادا سے مل کر کیا کرو گے۔ وہ ہوتے تو ایسی پھٹکار سناتے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔''

جگو مامتا سے بھرے ہوئے لہجہ میں بولی: ''تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے منہ سے ایسی باتیں نہ نکلتیں۔ تمہارا کلیجہ بڑا سخت ہے۔ دوسرا مرد ہوتا تو کیا اس طرح چپ چاپ سنتا۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی کہ کہیں تمہارے اوپر ہاتھ نہ چلا دیں، مگر ہیں بڑے غمخوار۔''

جالپا نے اسی بے رحمی سے کہا: ''اسے غمخوار نہیں کہتے دادی۔ یہ بے حیائی ہے۔''

دیبی دین نے آ کر کہا: ''یہاں بھیا آئے تھے؟ مجھے موٹر پر راستہ میں دکھائی دیئے تھے۔''

جگو نے کہا: ''ہاں آئے تھے۔ کہہ گئے ہیں، دادا مجھ سے مل لیں۔''

دیبی دین نے بے دلی سے کہا: ''ہاں مل لوں گا۔ کچھ اور بات چیت ہوئی؟''

جگو پچھتائی ہوئی بولی: ''بات چیت کیا ہوئی۔ پہلے میں نے پوجا کی۔ میں چپ ہوئی تو بہو نے اچھی طرح مالا پھول چڑھایا۔''

جالپا نے بے باکی سے کہا: ''آدمی جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔''

جگو: ''اپنا ہی سمجھ کر آئے تھے۔''

جالپا: ''کوئی بلانے تو گیا نہ تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے دیبی دین سے پوچھا کہ: ''وٹیش کا پتا لگا دادا؟''

دیبی دین نے کہا: ''ہاں پوچھ آیا، ہوڑے میں گھر ہے۔ پتا ٹھکانہ سب معلوم ہے۔''

جالپا: ''تو اسی وقت چلو گے یا کل کسی وقت؟''

دیبی: ''تمہاری جیسی خوشی۔ جی چاہے ابھی چلو۔ میں تیار ہوں۔''

جالپا: ''تھک گئے ہوگے؟''

دیبی: ''ایسے کاموں میں تھکن نہیں ہوتی۔''

آٹھ بج گئے تھے۔ سڑک پر موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سڑک کی دونوں پٹریوں پر ہزاروں عورت مرد بنے ٹھنے ہنستے بولتے جاتے تھے۔ جالپا نے سوچا، دنیا کیسی اپنے راگ رنگ میں مست ہے۔ جسے اس کے لیے مرنا ہو مرے۔ وہ اپنی عادت نہ چھوڑے گی۔ ہر ایک اپنا چھوٹا سا مٹی کا گھروندا بنائے بیٹھا ہے۔ ملک تباہ ہو جائے اسے غم نہیں۔ اس کا گھروندا بچا رہے۔ جالپا کا بھولا بھالا دل اس وقت بازار کو بند دیکھ کر خوش ہوتا۔ لوگ غم سے سر جھکائے یا غصہ سے تیوریاں بدلے نظر آتے۔ وہ نہ جانتی تھی کہ خلقت کے اس سمندر میں ایسی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے گرنے سے ایک ہلکورا بھی نہیں اٹھتا۔ آواز تک نہیں آتی۔

رما موٹر پر بیٹھ کر چلا تو اسے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ جانے ہوئے راستے اس کے لیے انجان ہو گئے تھے۔ اسے جالپا پر غصہ نہ آتا تھا۔ ذرا بھی نہیں۔ جگو پر بھی اسے غصہ نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا اپنی کمزوری پر اور اپنی بے شرمی اور بے عزتی پر۔ پولیس والوں کے زیر اثر اس کے ضمیر پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ کتنی بڑی بے انصافی کرنے جا رہا تھا۔ افسروں نے بڑی بڑی امیدیں بندھا کر اسے بہلا رکھا۔ اس کے بعد اسے جالپا سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پولیس کا رنگ اس پر جمتا گیا۔ آج وہ ایک جڑاؤ ہار جیب میں رکھے جالپا کو اپنی کامیابی کی خوشخبری دینے گیا تھا۔ جانتا تھا کہ جانپا پہلے کچھ ناک بھوؤں سکوڑے گی، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہار دیکھ کر وہ ضرور خوش ہو جائے گی۔ کل ہی صوبہ متحدہ کے ہوم سیکرٹری کے نام پولیس کمشنر کا سفارشی خط اسے مل جائے گا۔ دو چار دن اور لطف صحبت اٹھانے کے بعد وہ گھر کی راہ لے گا۔ دیبی دین اور جگو کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ ان کا احسان وہ کیونکر بھول سکتا تھا۔ یہی منصوبہ دل میں باندھ کر وہ جالپا کے پاس گیا تھا۔ جیسے کوئی بے چاری پھول اور شیرینی لے کر دیوتا کی پوجا کرنے جائے، لیکن دیوتا نے اس کے تھال کو ٹھکرا دیا، اس کے پھولوں کو پیروں سے کچل ڈالا۔

اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آج پولیس کے محفوظ دائرۂ اثر سے باہر نکل کر آزادی کی فضا میں اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔ اب اپنی خباثت اسے اصلی روپ میں نظر آئی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان پیدا ہوا کہ اسی وقت جج کے پاس جائے اور سارا واقعہ کہہ سنائے۔ کیا جج فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ ابھی تو سب ہی ملزم حوالات میں ہیں۔ پولیس والوں کے دانت پیسنے کا اسے مطلق خوف نہ تھا۔ جالپا

کی وہ غصے میں بھری ہوئی صورت اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔ اف کتنے طیش میں تھی۔ اگر وہ جانتا کہ جالپا اتنی برہم ہو جائے گی تو چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی، اپنا بیان ضرور بدل دیتا۔ اگر کہیں جج نے سماعت نہ کی اور ملزموں کو بری نہ کیا تو جالپا اس کا منہ نہ دیکھے گی۔ پھر وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ کس کے لیے۔

اس نے موٹر روکی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہاں آ گیا۔ یکا یک چوکیدار نظر آ گیا۔ رما نے اس سے جج کے بنگلے کا پتا پوچھا۔ چوکیدار ہنس کر بولا: ''حضور تو بہت دور نکل آئے۔ یہاں سے تو چھ سات میل سے کم نہ ہوگا۔ وہ ادھر چورنگی کی طرف رہتے ہیں۔''

رما چورنگی کی طرف چلا۔ نو بج گئے تھے۔ معلوم نہیں جج سے ملاقات بھی ہوگی یا نہیں۔ کچھ بھی ہو آج ان سے بغیر اپنی سرگزشت کہے وہ نہیں لوٹے گا۔ اگر انہوں نے کچھ سماعت کی تو اچھا ہی ہے۔ نہیں تو وہ کل ہائی کورٹ کے ججوں سے کہے گا۔ کوئی تو سنے گا۔ وہ سارا واقعہ اخباروں میں چھپوا دے گا۔ تب تو سب کی آنکھیں کھلیں گی۔

موٹر تیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ دس ہی منٹ میں چورنگی آ پہنچی۔ یہاں ابھی تک وہی چہل پہل تھی، مگر اس ناٹے سے موٹر لیے جاتا تھا۔ یکا یک ایک پولیس مین نے لال بتی دکھائی۔ رما نے موٹر روک لی اور سر باہر نکالا کر دیکھا تو وہی داروغہ جی۔

داروغہ نے پوچھا: ''کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں گئے؟ کہیے بیگم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے تو سمجھا تھا، وہ بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ خوش تو خوب

ہوئی ہوں گی؟''

رما نے بات بنا کر کہا: ''جی ہاں بہت خوش ہوئیں۔''

''میں نے تو کہا ہی تھا۔عورتوں کی ناراضگی کی یہی دوا ہے۔آپ کانپے جاتے تھے۔''

''میری حماقت تھی۔''

''چلیے، انسپکٹر صاحب بھی آتے ہوں گے۔اب آپ مسز رماناتھ کو بنگلے پر ہی کیوں نہیں بلا لیتے؟''

رما نے کہا: ''ابھی تو مجھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا ہے۔آپ موٹر لے جائیں۔میں پاؤں پاؤں چلا آؤں گا۔''

داروغہ نے موٹر کے اندر بیٹھ کر کہا: ''نہیں صاحب مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ جہاں چاہیں چلیے، میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔''

رما نے کچھ ترش ہو کر کہا: ''میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں ابھی بنگلے پر نہیں جا رہا ہوں۔''

داروغہ نے مسکرا کر کہا: ''میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔''

.رما نے جھانک کر کہا: ''آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں، وہ بالکل غلط ہے۔میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔''

داروغہ نے کچھ نادم ہو کر کہا: ''اچھا صاحب خطا ہوئی معاف کیجیے، لیکن ابھی آپ اپنے آپ کو خطرے سے باہر نہ سمجھیں۔آپ کو کسی ایسی جگہ نہ جانے دوں گا، جہاں مجھے پورا اطمینان نہ ہو گا۔میں آپ ہی کے فائدے کے خیال سے یہ

عرض کر رہا ہوں۔''

رما نے ہونٹ چبا کر کہا: ''بہتر ہو آپ میرے فائدے کا اتنا خیال نہ کریں۔ آپ لوگوں نے مجھے مایا میٹ کر دیا اور اب بھی گلا نہیں چھوڑتے۔ مجھے اب اپنے حال پر مرنے دیجیے۔ میں اس غلامی سے تنگ آ گیا ہوں۔''

یہ کہتا ہوا وہ موٹر سے اتر پڑا۔ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ داروغہ نے کئی بار پکارا، لیکن اسے نے پیچھے پھر کر دیکھا تک نہیں۔ کچھ دور جا کر وہ ایک موڑ پر گھوم گیا۔ اسی سڑک پر جج کا بنگلہ تھا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ رما کبھی اس بازو پر، کبھی اس بازو پر جا جا کر بنگلوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلا جاتا تھا۔ یکا یک جج کا نام دیکھ کر وہ رک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ خیال آیا جج نے پوچھا تم نے جھوٹی گواہی کیوں دی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ یہ کہنا کہ پولیس نے مجھ سے زبردستی گواہی دلوائی، ترغیبیں دیں اور تشدد کیا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ پوچھے کہ تم نے محض دو تین سال کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون سر پر لے لیا تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑے گا۔ بے وقوف بنایا جاؤں گا۔ وہ انہی پاؤں پر لوٹ پڑا۔ اس ذلت کا مقابلہ کرنے کی کی اس میں ہمت نہ تھی۔

(45)

رما آدھی رات گئے سویا تو نو بجے دن تک نیند نہ کھلی۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

ونیش کو پھانسی ہورہی ہے۔اسی وقت داروغہ نے آ کر کہا: ''آج آپ خوب سوئے بابو صاحب! کل کب سوئے؟''

رما نے لیٹے لیٹے ہی اسے جواب دیا: ''ذرا دیر بعد لوٹ آیا۔اس مقدمہ کی اپیل تو ہائی کورٹ میں ہوگی؟''

داروغہ: ''اپیل کیا ہوگی، ضابطہ کی پابندی ہوگی۔آپ نے مقدمہ کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب وہ کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتا۔''

دفعتاً ڈپٹی اور انسپکٹر پولیس دونوں آ پہنچے۔ڈپٹی صاحب نے کہا: ''ابھی تو آپ سویا ہوا ہے۔کمشنر صاحب آپ سے بہت خوش ہے۔یہ دیکھئے انہوں نے آپ کو یہ سفارشی چٹھی دی ہے۔بس یہی سمجھ لیجیے کہ آپ کی تقدیر کھل گئی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ رما کی طرف بڑھایا۔رما نے لفافہ کھول کر دیکھا۔یکا یک اسے پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر ڈالا۔تینوں آدمی حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔

داروغہ نے تیز ہو کر کہا: ''یہ آپ نے کیا حماقت کی؟''

انسپکٹر: ''حلف سے کہتا ہوں کمشنر صاحب کو معلوم ہوگا تو بہت ناراض ہوں گے۔''

ڈپٹی: ''اس کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہیں؟''

رما: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس خط کی ضرورت نہیں اور نہ میں نوکری چاہتا ہوں۔میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

ڈپٹی: ''جب تک ہائی کورٹ کا فیصلہ نہ ہو جائے، آپ کہیں نہیں جا سکتے۔''

رما: ''کیوں؟''

ڈپٹی: ''کمشنر صاحب کا یہ حکم ہے۔''

رما: ''میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔''

انسپکٹر: ''بابو صاحب! آپ ناحق بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ دس پانچ دن میں ہائی کورٹ سے فیصلہ کی تصدیق ہو جائے گی۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ جو صلہ مل رہا ہے، اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیجیے اور آرام سے زندگی کے دن بسر کیجیے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن آپ بھی اونچے منصب پر ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ افسروں کی ذرا سی نگاہ بدل جائے تو آپ کا کہیں پتا نہیں لگے۔ حلف سے کہتا ہوں پولیس کے ایک ذرا سے اشارے پر دس سال کی سزا ہو جائے گی۔ آپ ہیں کس زعم میں۔ ہم آپ کے ساتھ دغا نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں اگر ہمیں بھی پولیس کی چالیں چلنی پڑیں گی، جیل کو آسان نہ سمجھئے گا۔ خدا دوزخ میں لے جائے، جیل کی سزا نہ دے۔ حلف سے کہتا ہوں کہ جیل دوزخ سے بھی بدتر ہے۔''

داروغہ: ''یہ بیچارے اپنی بیوی سے مجبور ہیں۔ وہ شاید ان کی جان کی گاہک ہو رہی ہے۔''

انسپکٹر: ''کیا ہوا، کل تو آپ وہ ہار لے گئے تھے۔ پھر بھی ان کا منہ سیدھا نہ ہوا؟''

رما نے کوٹ کی جیب سے ہار نکال کر میز پر رکھ دیا اور بولے: ''وہ ہار رکھا

ہے۔''

ڈپٹی: ''کوئی مغرور عورت ہے۔''

انسپکٹر: ''کچھ ان کی بھی مزاج پرسی کرنی پڑے گی۔''

داروغہ: ''یہ تو بابو صاحب کے سلیقے اور برتاؤ پر منحصر ہے۔''

ڈپٹی: ''اس کھٹک سے بھی چھٹکارہ لینا چاہیے۔''

رمانا تھ کے سامنے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ممکن تھا وہ اپنے کو فرض پر قربان کر دیتا۔ دو چار سال کی سزا کے لیے بھی تیار ہو جاتا۔ شاید اس نے ان سختیوں کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا، لیکن اپنے ساتھ جالپا کو بھی مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ کسی طرح نہ کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پولیس کے پنجے میں کچھ اس طرح پھنس گیا ہے کہ اس کے بے داغ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ پولیس سے ہرگز پیش نہیں پا سکتا۔ اس خیال نے اس کی تیزی اور تندی غائب کر دی۔ بیکسانہ انداز سے بولا:

''آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری، گویا کہہ رہے ہوں آ گیا پنجے میں اور بولے:

''بس ہم اتنا ہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے مہمان بنے رہیں اور مقدمہ ہائی کورٹ سے طے ہو جانے کے بعد خوش خوش رخصت ہو جائیں، کیونکہ اس کے بعد ہم آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ابھی جو خط آپ نے پھاڑ کر پھینک دیا ہے، اس کی نقل دوبارہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ دور اندیش ہیں تو اس سے

اپنی زندگی کی اصلاح میں کام لیں گے۔ نہیں تو ادھر ادھر کے دھکے کھائیں گے اور آپ کے اوپر گناہ بےلذت کی مثل صادق آئے گی۔ اس کے سوا ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے۔''

تینوں افسر رخصت ہو گئے اور رما ایک۔ گار جلا کر ان معاملات پر غور کرنے لگا۔

(46)

ایک مہینہ اور نکل گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ رما پر پھر پولیس کا رعب غالب آ گیا ہے اور وہ پھر سابق دستور افسروں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ شراب پینے لگا ہے اور اس کی مزید دلچسپی کے لیے پولیس نے زہرہ نام کی ایک نازنین کو بھی مقرر کر دیا ہے۔ خوش گلو ہے اور مزاج شناس ہے۔ اس نے اپنی ہمدردانہ باتوں سے رما ناتھ کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی سادگی اور خلوص نے زہرہ کو بھی اس سے مانوس کر دیا ہے۔ اب تک اسے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ سبھی اسے ایک آلۂ تفریح سمجھتے تھے۔ رما وہ پہلا آدمی تھا، جو اس کوچہ سے ناواقف ہونے کے باعث اسے اپنا شریک غم بنانا چاہتا تھا۔

ایک دن اس نے دوران گفتگو زہرہ سے کہا: ''تم مجھ پر اتنی مہربان ہو کہ میں ڈرتا ہوں کہ تمہاری محبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں، مگر تم سے وفا کی امید ہو سکتی

ہے؟''

زہرہ نے دل میں خوش ہو کر اپنی مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''ہم وفا کیا جانیں۔ ہمارا تو پیشہ ہی حسن فروشی ہے۔''

رما: ''کیا اس میں کوئی شک بھی ہے؟''

زہرہ: ''مطلق نہیں۔ آپ لوگ ہمارے پاس محبت سے لبریز دل لے کر آتے ہیں، مگر ہم اتنے بے وفا ہیں کہ اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔ ہے یہی بات نہ؟''

رما: ''بے شک!''

زہرہ: ''معاف کیجیے گا۔ آپ مردوں کی طرف داری کر رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگ ہمارے پاس محض تفریح کے لیے آتے ہیں۔ محض غم غلط کرنے کے لیے۔ محض نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے۔ جہاں آپ کو وفا کی تلاش ہی نہیں، وہاں وفا ہے کیونکر! لیکن اتنا ہی جانتی ہوں کہ ہم میں جتنی بے چاریاں مردوں کا جبر اور بے وفائی سے مایوس ہو کر خون جگر پیتی ہیں۔ ان کا پتا اگر دنیا کو چلے تو آنکھیں کھل جائیں۔ یہ ہماری حماقت ہے کہ تماش بینوں سے وفا کی امید رکھتی ہیں، مگر پیاسا آدمی اندھے کنویں کی طرف دوڑے تو میرے خیال میں اس کا کوئی قصور نہیں۔''

آج جب زہرہ یہاں سے چلی تو اس نے داروغہ صاحب کو یوں رپورٹ کی: ''آج تو حضرت خوب مزے میں آئے۔ خدا نے چاہا تو چار دن کے بعد بیوی کا نام بھی نہ لیں گے۔''

داروغہ نے خوش ہو کر کہا: ''یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ رکھا تھا۔ لطف تو جب ہے کہ اس کی بیوی مایوس ہو کر چلی جائے۔ ایسے گاؤدیوں کو سبز باغ دکھانا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

زہرہ کی آمد و رفت بڑھنے لگی۔ آخر کار رما خود اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ اس نے زہرہ سے الفت کا سوانگ بھر کر افسروں کی نگاہوں میں اپنا وقار جمانا چاہا، لیکن زہرہ اب اسے وفا اور محبت کی دیوی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جالپا کی سی حسین نہ سہی، اظہار محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہوشیار، ناز و ادا میں اس سے کہیں زیادہ پختہ کار اور سحر آفرینی میں کہیں زیادہ مشاق تھی۔ سر دلوح رما کے دل میں نئے نئے منصوبے پیدا ہونے لگے۔

ایک دن اس نے زہرہ سے کہا: ''زہرہ جدائی کی گھڑی آ رہی ہے۔ دو چار دن میں یہاں سے جاؤں گا۔ پھر تو تمہیں میری یاد بھی نہ آئے گی۔''

زہرہ نے محبت آمیز لہجہ میں کہا: ''اب تمہیں نہ جانے دوں گی۔ یہیں کوئی اچھی سی نوکری کر لینا۔ پھر ہم دونوں آرام سے رہیں گے۔''

رما مخمور ہو کر بولا: ''یہ دل سے کہتی ہو زہرہ؟ دیکھو تمہیں میرے سر کی قسم! دغا مت دینا۔''

زہرہ: ''اگر یہ خوف ہے تو نکاح پڑھا لو۔ نکاح کے نام سے نفرت ہو تو شادی کر لو۔ اب اس کے سوا اپنی محبت کا کیا ثبوت دوں؟''

خلوص میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے رما کو متوالا کر دیا۔ اس نے سوچا، یہ نازنین جس پر بڑے بڑے رئیس فدا ہیں، میرے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کو

تیار ہے۔اس کی خوش نصیبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔جس کان میں دوسروں کو بالوں کے ذرے ملتے ہیں، اس میں اسے سونے کے ڈلے مل گئے۔کیا یہ حسن تقدیر نہیں ہے۔رما کے دل میں کئی روز کشمکش ہوتی رہی۔جالپا کے ساتھ آنے والی زندگی کا خیال کر کے وہ مایوس ہو جاتا تھا۔وہ زندگی کتنی خشک اور صبر آزما ہوگی۔جالپا قدم قدم پر فرض اور حق کا جھنڈا لے کر کھڑی ہو جائے گی اور اسے زاہدوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔فقیرانہ زندگی میں رما کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔

عام آدمیوں کی طرح وہ بھی عیش و آرام چاہتا تھا۔زندگی کے مزوں سے اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔تپسوی جالپا کی طرف سے ہٹ کر اس کا عیش پرور دل زہرہ کی طرف دوڑا۔اسے نازفروشوں کی مثالیں یاد آنے لگیں، جن کی عصمت کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔اس کے ساتھ ہی رنگین مزاج اور روفا شعار بیویوں کی مثالیں بھی آ پہنچیں۔اس نے دل میں فیصلہ کیا یہ سب ڈھکوسلا ہے۔انسان کی طبیعتیں جدا جدا ہیں۔پردہ کے باہر آ جانے سے کوئی گنہگار نہیں ہو جاتا اور نہ پردے کے اندر بیٹھ کر کوئی عصمت مآب ہو جاتا ہے۔یہ سب زندگی کے اتفاقات ہیں۔

زہرہ روز آتی اور بندھن میں ایک گانٹھ دے کر چلی جاتی۔ان حالات میں کئی مستقل مزاج نوجوانوں کے بھی آسن ڈول جاتے۔رما تو عیش کا بندہ تھا۔اب تک وہ محض اس لیے بےراہ نہ ہوا تھا کہ جوں ہی اس نے پر نکالے، صیاد نے اسے پنجرے میں قید کر لیا۔کچھ دن پنجرے سے باہر آ جانے پر بھی اسے پرواز کی ہمت نہ ہوئی۔اب اس کے سامنے ایک نیا اور وسیع منظر تھا۔وہ چھوٹا سا مکھیوں والا پنجرہ

نہیں، بلکہ پھولوں سے لہراتا ہوا باغ، جہاں کی قید میں بھی آزادی کا مزا تھا۔

(47)

رما جوں جوں زہرہ کے دامِ الفت میں پھنستا جاتا تھا، پولیس کے افسر اس کی طرف سے بےفکر ہوتے جاتے تھے۔ اس کے اوپر جو قید لگائی گئی تھی، وہ رفتہ رفتہ ترک ہوتی جاتی تھی۔ ایک دن رما ڈپٹی صاحب کے ساتھ سیر کرنے لگا تو موٹر دیبی دین کی دکان کے سامنے سے گزری۔ رما نے اپنا سر اندر کھینچ لیا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔

وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جالپا ہے یا چلی گئی، لیکن دیبی دین کی دکان پر نہ جا سکا۔ دل میں اب بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں نے جو راستہ پکڑا ہے، وہ بہت مخدوش ہے، لیکن یہ جان کر بھی وہ اسے چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ دیبی دین کو دیکھ کر اس کا سر آپ ہی آپ شرم سے جھک جاتا۔ وہ کسی دلیل سے اپنے اطوار کی حمایت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ لوگوں سے اب ملنا جلنا چھوڑ دے۔ شہر میں تین آدمیوں کے سوا چوتھے آدمی سے اس کی ملاقات یا راہ و رسم نہ تھی، جس کی حرف گیری کی اسے پروا ہوتی۔

موٹر ادھر ادھر گھومتی ہوئی ہاوڑا کے پل کی طرف جا رہی تھی کہ یکا یک رما نے ایک عورت کو سر پر گنگا جل کا کلسا رکھے گھاٹوں کے اوپر چڑھتے دیکھا کہ اس کے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے اور اتنی ناغر تھی کہ کلسے کے بوجھ سے اس کی کمر

دوہری ہو رہی تھی۔ اس کی چال کچھ کچھ جالپا سے ملتی ہوئی معلوم ہوئی۔ رما نے سوچا جالپا یہاں کیا کرنے آئے گی۔ کوئی دوسری عورت ہو گی۔ اس کی صورت دیکھ کر مزید اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

مگر ایک ہی لمحے میں کار اور آگے بڑھ گئی اور رما کو اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ جالپا ہی تھی۔

اس نے کھڑکی کی بغل میں سر جھکا دیا۔ بیشک جالپا تھی، مگر کتنی لاغر اندام، گویا کوئی بے کس ضعیفہ ہو۔ چہرے پر نہ رونق تھی، نہ وہ سادگی اور نہ وہ غرور۔ رما بے درد نہ تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

جالپا اس حالت میں اور اس کے جیتے جی! غالباً دینی دین نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور وہ مزدوری کر کے زندگی بسر کر رہی ہے، مگر نہیں۔ دینی دین اتنا بے مروت نہیں ہے۔ جالپا نے خود اس کے سایہ حمایت میں رہنا منظور نہ کیا ہو گا۔ عالی ظرف تو ہے ہی، مگر کسے معلوم ہو کیا بات ہے۔

موٹر دور نکل آئی تھی۔

رما کی ساری شوقین مزاجی، ساری شوریدہ سری غائب ہو گئی۔ اس میلے کپڑے والی ستم رسیدہ جالپا کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ کس سے پوچھے۔ کہاں جائے۔ جالپا کا نام بھی زبان پر آ جائے تو سب کے سب بدگمان ہو جائیں اور اسے قید تنہائی میں ڈال دیں۔ ہائے جالپا کے چہرے پر کتنی حسرت تھی۔ آنکھوں میں کتنی بے کسی۔

کچھ دیر بعد زہرہ آئی، مسکراتی اور چہکتی۔ رما اس سے کچھ بھی مخاطب نہ ہوا۔

زہرہ نے پوچھا:

''آج کسی کی یاد آ رہی ہے کیا؟''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گول مکھن سی نرم بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

رما نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ اس طرح اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا، گویا اب یہی سہارا ہے۔

زہرہ نے دردمندانہ لہجہ میں پوچھا: ''سچ بتاؤ آج اتنے اداس کیوں ہو۔ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟''

رما نے رقت آمیز انداز سے کہا: ''نہیں زہرہ تم نے مجھ بدنصیب پر جتنا رحم کیا ہے، اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم نے مجھے اس وقت سنبھالا، جب میری زندگی کی ٹوٹی ہوئی کشتی غوطے کھا رہی تھی۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے مبارک دن ہیں اور میں اپنے سینے میں انہیں ہمیشہ محفوظ رکھوں گا، مگر بدنصیبوں کی دنیا میں آسائش کہاں۔ میں نے آج جالپا کو جس صورت میں دیکھا ہے، وہ میرے دل کو بھالوں کی طرح چھید رہا ہے۔ آج وہ پھٹے اور میلے کپڑے پہنے سر پر پانی کا کلسا لیے چلی جا رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی صدمہ نہ ہوا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس پر کیا گزر رہی ہے۔''

زہرہ نے پوچھا: ''وہ تو اس مالدار کھٹک کے گھر پر تھیں؟''

رما: ''ہاں تھی تو، مگر نہیں کہہ سکتا کیوں وہاں سے چلی گئی۔ میرے ساتھ ڈپٹی

صاحب تھے، ان کے سامنے میں اس لیے کچھ پوچھ نہ سکا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اور شاید مجھے حقیر سمجھتی، مگر کم سے کم مجھے اتنا معلوم تو ہو جاتا کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ زہرہ! تم اپنے دل میں چاہے جو سمجھ رہی ہو، لیکن میں اس خیال میں مست ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور محبت کرنے والے سے ہم کم سے کم ہمدردی کی امید رکھتے ہیں۔ یہاں ایک بھی ایسا آدمی نہیں، جس سے میں اپنے دل کا درد کہہ سکوں۔ تم بھی مجھے گمراہ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھیں، مگر تمہیں مجھ پر رحم آ گیا۔ شاید تم نے ایک گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر خدانخواستہ آج ہم میں اور تم میں کسی وجہ سے بدمزگی ہو جائے تو کیا کل تم مجھے مصیبت میں دیکھ کر ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی۔ کیا مجھے بھوکوں مرتے دیکھ کر میرے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ کرو گی، جو آدمی کتوں کے ساتھ کرتا ہے؟ کیا اس وقت تم میرے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی؟ زہرہ تم اگر چاہو تو جالپا کا پورا پتا لگا سکتی ہو۔ وہ کہاں ہے، کیا کرتی ہے؟ میری طرف سے اس کے دل میں کیا خیال ہے۔ گھر کیوں نہیں جاتی؟ یہاں کب تک رہنا چاہتی ہے؟

اگر تم جالپا کو گھر جانے پر راضی کر سکو تو میں عمر بھر تمہاری غلامی کروں گا۔ اس خستہ حالی میں میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ایسے صدمہ ہو رہا ہے کہ شاید میں آج رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھ پر کیا گزرے گی اس کا مطلق مجھے غم نہیں ہے۔ میں دلیر نہیں ہوں۔ خطرہ کے سامنے ہمیشہ میرا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، لیکن میری بےغیرتی بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتی۔"

زہرہ طوائف تھی، بھلے برے سبھی قسم کے آدمیوں سے اسے سابقہ پڑ چکا تھا۔

آدمیوں کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس پردیسی نوجوان میں اسے وہ چیز ملی، جس کا دوسروں میں کہیں پتا نہ تھا۔ اسکی زندگی میں زہرہ کو یہ پہلا آدمی ملا تھا، جس نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ایسے وفادار اور محبت کے پتلے کو وہ مایوس نہ کر سکتی تھی۔ رما کی باتیں سن کر اسے ذرا بھی حسد نہ ہوا، بلکہ اس کے دل میں ایک خودغرضانہ امانت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس موقع پر رما کو خوش کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا سکتی تھی۔ جالپا سے اسے کوئی خوف نہ تھا۔ جالپا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ زہرہ اپنی عشوہ طرازی، اپنی دل لبھانے والی اداؤں سے اس کا رنگ پھیکا کر سکتی تھی۔ اس نے بارہا گلزار کھترانیوں کو رلا کر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جالپا کس شمار میں تھی۔

زہرہ نے اس کی دلجوئی کر کے کہا: ''تو اس کے لیے تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو؟ زہرہ تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ میں کل ہی جالپا کو تلاش کروں گی۔ وہ یہاں رہنا چاہیں گی تو ان کے آرام کا سامان مہیا کروں گی۔ جانا چاہیں گی، تو ریل پر بٹھا دوں گی۔''

رما نے بڑی عاجزی سے کہا: ''ایک بار میں اس سے مل لیتا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔''

زہرہ نے فکرمند ہو کر کہا: ''یہ تو مشکل ہے۔ تمہیں یہاں سے کون جانے دے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں جالپا کو پارک میں کھڑی کر آؤں۔ تم ڈپٹی صاحب کے ساتھ وہاں جاؤ اور کسی بہانہ سے اس سے مل لو۔''

رما کچھ کہنا چاہتا تھا کہ داروغہ جی نے پکارا: ''مجھے بھی خلوت میں آنے کی اجازت ہے؟''

دونوں سنبھل کر بیٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ داروغہ جی مسکراتے ہوئے آئے اور زہرہ کی بغل میں بیٹھ کر بولے: ''یہاں آج سناٹا کیسا؟ کیا آج خزانہ خالی ہے؟ زہرہ آج اپنے دست حنائی سے ایک جام بھر دو۔ رما بھائی جان ناراض نہ ہونا۔''

رما نے ترش ہو کر کہا: ''اس وقت رہنے دیجیے داروغہ جی۔ آپ تو پیئے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

داروغہ نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''بس ایک جام زہرہ اور پھر ایک رات اور آج میری مہمانی قبول کرو۔''

رما نے گرم ہو کر کہا: ''آپ اس وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔''

دونوں آدمیوں میں بحث ہونے لگی۔ داروغہ کا اصرار تھا کہ زہرہ اس کے ساتھ جائے۔ رما کہتا ہے، اس وقت وہ ہرگز نہیں جا سکتی۔ اگر وہ گئی تو میں اس کا اور آپ کا خون پی جاؤں گا۔ آخر داروغہ صاحب نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ رما اب ضبط نہ کر سکا۔ اس نے داروغہ کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ داروغہ مضبوط آدمی تھا لیکن اس وقت نشہ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر گالیاں بکنے اور دروازہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

رما نے زہرہ سے کہا: ''کہو تو جا کر بچہ کو برآمدے کے نیچے دھکیل دوں؟''

زہرہ: ''بکنے دو۔ آپ ہی چلا جائے گا۔ شاید چلا گیا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ سور کو نکال باہر کیا۔ مجھے لے جا کر ذبح کرتا۔''

زہرہ: ''اور جو وہ کل سے مجھے نہ آنے دے؟''

رما: ''اگر اس نے ذرا بھی شرارت کی تو گولی مار دوں گا۔ وہ دیکھو طاق پر پستول رکھا ہوا ہے۔ تم اب میری ہو زہرہ! میں نے اپنا سب کچھ تمہارے اوپر نثار کر دیا۔ کسی دوسرے آدمی کو ہمارے بیچ میں آنے کا حق نہیں ہے۔ جب تک میں نہ مر جاؤں۔''

(48)

رما سارا دن بیتاب رہا۔ کبھی مایوسی کی اندھیری گھاٹیاں سامنے آ جاتیں۔ کبھی امید کی لہراتی ہوئی ہریالی۔ زہرہ، جالپا کی تلاش میں گئی بھی ہوگی۔ یہاں سے تو بڑے لمبے چوڑے وعدے کر کے گئی تھی مگر اسے کیا غرض ہے۔ آ کر کہہ دے گی، ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہیں جا کر ڈپٹی صاحب سے سارا راز فاش کر دے تو بیچاری جالپا پر بیٹھے بٹھائے آفت آ جائے، مگر زہرہ اتنی سفلہ مزاج نہیں ہے۔ اگر زہرہ جیسی عورت اتنی بےوفا ہو سکتی ہے تو یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں۔ رما کو وہ دن یاد آئے جب اس کے دفتر سے آتے ہی جالپا اس کی جیت ٹٹولتی تھی اور روپے نکال لیتی تھی۔ وہی جالپا آج اتنی پاک نفس ہو گئی۔ تب وہ پیار کرنے کی چیز تھی۔ اب وہ پرستش کی چیز ہے۔

رما کو اپنی اس غلطی پر افسوس ہو رہا تھا، جو اس نے جالپا کی بات نہ مان کر کی تھی۔ اگر اس نے اس کی مرضی کے مطابق جج کے اس اجلاس میں اپنا بیان بدل دیا